فکر و نظر..... اسلام آباد جلد: ۴۴ شمارہ: ۴

# مقاصد شریعت کی روشنی میں اجتہاد کی حالیہ کوششیں☆

محمد نجات اللہ صدیقی☆☆

اس مقالہ میں ہماری کوشش ہو گی کہ یہ معلوم کریں کہ بیسویں صدی کی آخری دہائیوں اور اکیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں مسلمانوں کے درمیان نئے مسائل پر ہونے والے غور و فکر، بحث و نظر اور اختلافی امور میں فیصلہ تک پہنچنے کی روئداد کیا رہی۔ اس عمل کے دوران مقاصدِ شریعت کی طرف رجوع کی کیا کیفیت رہی، کیا اس ریکارڈ میں مستقبل کے لیے کچھ سبق ہیں جن کو سیکھ کر آئندہ بہتر نتائج حاصل کئے جا سکتے ہیں؟ یہ مطالعہ ہمیں اپنے اصل سوال کو سمجھنے میں مفید ہو سکتا ہے کہ، مقاصدِشریعت کی رہنمائی میں فیصلہ تک پہنچنے کا طریقہ کیا ہے؟۔

بعض اوقات انسان کو اپنے بدن یا اپنے ماحول کے بارے میں نئی معلومات حاصل ہوتی ہیں جن کی روشنی میں مقاصدِ شریعت کی تحصیل کے نئے امکانات سامنے آتے ہیں۔ مگر یہ معلومات یا متعلقہ امکانات مختلف فیہ ہو سکتے ہیں اور اس اختلاف کا فتویٰ اور فیصلہ پر اثر پڑ سکتا ہے۔ آئندہ صفحات میں وضاحت کے لیے ایک مثال پیش کی جائے گی۔

اس جائزہ کے بعد ہم بعض ایسی مثالیں پیش کریں گے جن میں وقت گزرنے کے ساتھ فتوے بدل گئے، دریں حالیکہ پہلے فتویٰ میں بھی مصالح اور مقاصد پیشِ نگاہ تھے اور دوسرے فتویٰ میں بھی ان ہی کا حوالہ دیا گیا ہے۔

پہلے مرحلہ پر اس مطالعہ کے لیے ہم نے جن مسائل حاضرہ کا انتخاب کیا ہے وہ درجِ ذیل ہیں:

☆ مسلمان عورت کتابی مرد کے نکاح میں۔

---

☆ محمد نجات اللہ صدیقی صاحب کے چار مقالات فکر و نظر کے درج ذیل شماروں میں طبع ہو چکے ہیں۔ یہ مقالہ بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔

۱۔ مقاصد شریعت، ایک عصری مطالعہ۔ اپریل، جون ۲۰۰۴ء

۲۔ مقاصد شریعت اور معاصر اسلامی فکر-وقائع اور امکانات۔ اکتوبر، دسمبر ۲۰۰۵ء

۳۔ مقاصد شریعت کی پہچان اور تطبیق میں عقل و فطرت کا حصہ۔ جنوری، مارچ ۲۰۰۶ء

۴۔ مقاصد شریعت کے فہم و تطبیق میں اختلاف کا حل

☆☆ وزیٹنگ پروفیسر، اسلامک ریسرچ اینڈ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ، اسلامی ترقیاتی بینک، جدہ-سعودی عرب۔

☆ غیر مسلم اکثریتی ممالک میں مسلمانوں کے لیے اور مسلم اکثریتی ممالک میں غیر مسلموں کے لیے، شہریت، حکومت میں شرکت اور فوج میں شمولیت وغیرہ۔

☆ عورت کی سربراہی۔

مذکورہ بالا مسائل میں سے ہر ایک اپنی آغوش میں مسائل کا ایک مجموعہ لیے ہوئے ہے۔ نیز ہر مسئلہ کا تعلّق زندگی کے ایک منفرد دائرے سے ہے۔

## مسلمان عورت کتابی مرد کے نکاح میں

فقہ میں یہ ایک طے شدہ مسئلہ ہے۔ مسلمان مرد اہلِ کتاب عورت سے نکاح کر سکتا ہے لیکن مسلمان عورت اہلِ کتاب مرد سے نکاح نہیں کر سکتی۔ اس سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ اگر اہلِ کتاب میاں بیوی میں سے شوہر مسلمان ہو جائے تو اس کی بیوی، اہلِ کتاب ہونے کے باوجود، اس کے نکاح میں رہے گی مگر بیوی مسلمان ہو جائے تو اس کا نکاح باقی نہیں رہے گا، اس کی اہلِ کتاب مرد سے علیحدگی لازم ہو گی۔ مگر جب سے مغربی ممالک میں، جہاں غالب اکثریت اہل کتاب کی ہے، قابل لحاظ مسلمان اقلیتیں بسنے لگیں انہیں کچھ ایسے حالات سے سابقہ پیش آیا جن میں اس حکم پر عمل سے شریعت کے مقاصد فوت ہوتے نظر آئے جن کی بنا پر بعض علماء نے جن میں یوسف قرضاوی اور حسن ترابی کا نام سرفہرست ہے، سابقہ حکم کو پیش نظر صورت حال کے لیے ناموزوں قرار دیتے ہوئے نیا فتویٰ دیا ہے۔

علامہ یوسف قرضاوی نے یہ کہا ہے کہ اگر کتابی میاں بیوی میں سے بیوی مسلمان ہو جائے مگر بیوی کو توقع ہو کہ وقت گزرنے کے ساتھ اس کا کتابی شوہر اسلام میں داخل ہو جائے گا تو وہ اس کے نکاح میں باقی رہے گی، البتہ اسے چاہیے کہ شوہر کے اسلام لانے تک اس کے ساتھ مباشرت نہ کرے۔

اس اجمال کی تفصیل اس فتویٰ میں ہے جو **المجلس الاوروبی للافتاء و البحوث** (European Council for Fatwa and Research) نے اپنے آٹھویں اجلاس منعقدہ جولائی ۲۰۰۱ء میں جاری کیا۔(۱) اس اجلاس کی صدارت شیخ یوسف قرضاوی کر رہے تھے جو اس مجلس کے صدر بھی ہیں۔

مجلس نے ان مختلف بحثوں اور تحقیقات پر غور کیا جو تین مسلسل جلسوں میں اس کے سامنے پیش

کی جاتی رہی تھیں، مختلف آراء پر مشتمل ہونے کے باوجود گہرائی اور تفصیل پر مشتمل تھیں۔ مجلس نے فقہی آراء کا ان کے دلائل کے ساتھ مطالعہ کیا اور ان کو قواعدِ فقہ اور اصول فقہ کی روشنی میں پرکھا نیز شریعت کے مقاصد کی روشنی میں جانچا۔ اس نے ان خاص حالات کی رعایت بھی ملحوظ رکھی جن سے ان نو مسلم خواتین کو مغربی ممالک میں سامنا کرنا پڑتا ہے جن کے شوہر اپنے مذہب پر قائم رہتے ہیں۔ مجلس تاکید کرتی ہے کہ مسلمان عورت کے لیے شروعات کے طور پر غیر مسلم مرد کے ساتھ شادی کرنا حرام ہے، اس پر امت کا اجماع ہے۔ اسلاف و اخلاف سب متفق ہیں۔ البتہ اگر یہ شادی اس عورت کے اسلام لانے سے پہلے ہوئی تھی تو اس بارے میں مجلس یہ طے کرتی ہے کہ:

نمبر تین: اگر بیوی مسلمان ہوئی اور شوہر اپنے مذہب پر قائم رہا تو مجلس کی رائے ہے کہ:

ا۔ اگر اس کا اسلام لانا اس کے شوہر کے اس کے ساتھ مباشرت کرنے سے پہلے ہو تو دونوں کے درمیان علیحدگی فوراً وا جب ہوگی۔

ب۔ اگر وہ عورت اس شوہر سے مباشرت کرنے کے بعد اسلام لائی ہو مگر اس کا شوہر عدت گزرنے سے پہلے مسلمان ہو جائے تو ان دونوں کا رشتہ نکاح باقی رہے گا۔

ج۔ اگر اس عورت کا اسلام لانا شوہر کے اس کے ساتھ مباشرت کرنے کے بعد ہوا اور عدّت کی مدّت بھی گذر گئی، تو اسے اختیار ہے کہ اس شوہر کے اسلام لانے کا انتظار کرے، چاہے یہ انتظار کتنا ہی طویل ہو۔ پھر اگر شوہر اسلام لے آیا تو وہ دونوں اپنے پہلے نکاح پر باقی سمجھے جائیں گے، اس نکاح کی تجدید کی کوئی ضرورت نہیں۔

د۔ اگر وہ عورت عدّت گزرنے کے بعد اپنے اس شوہر کے علاوہ کسی اور سے نکاح کرنا چاہے تو اسے عدالت کے ذریعہ اس نکاح کو فسخ کرانا ہو گا۔

مذاہب اربعہ کے نزدیک ایسی عورت کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ عدّت گزرنے کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ رہے، یا اس کو اپنے ساتھ (جنسی) تعلق قائم کرنے دے۔ مگر بعض علماء کی رائے میں اس کے لیے جائز ہے کہ اپنے اسی شوہر کے ساتھ رہتی رہے، ان تمام حقوق اور واجبات کے ساتھ جو بیوی ہونے کے ناتے وارد ہیں، بشرطیکہ وہ امید کرتی ہو کہ شوہر اسلام لے آئے گا اور (اس کے ساتھ ر ہنا) اس (عورت) کے دین میں رکاوٹ نہ ہو۔ اس رائے کی حکمت یہ ہے کہ عورتیں یہ جان کر اسلام میں داخل ہونے سے نہ رک جائیں کہ اسلام لانے سے ان کا اپنے شوہروں کو چھوڑنا اور خاندان کو خیرباد کہنا لازم آئے گا۔ (اس رائے کے حامل علماء) اپنی دلیل میں عمرؓ بن الخطّاب کے اس فیصلہ کا حوالہ دیتے ہیں جو آپ نے حیرہ میں رہنے والی اس عورت کے بارے میں دیا تھا جو

خود اسلام لائی تھی مگر اس کا شوہر مسلمان نہیں ہوا تھا، کہ اگر وہ چاہے تو اس آدمی کو چھوڑ دے اور چاہے تو اسی کے ساتھ باقی رہے۔

یہ روایت یزید بن عبداللہ الخطمی سے ثابت ہے۔ اسی طرح یہ علماء امیر المؤمنین علیؓ بن ابی طالب کی اس رائے کو بھی دلیل میں پیش کرتے ہیں کہ اگر کوئی عیسائی عورت جو کسی یہودی یا عیسائی مرد کی بیوی ہو اسلام لے آئے تو چوں کہ اس کے ساتھ ایک عہد ہو چکا ہے اس لیے اس مرد کا اس عورت کے (جنسی عضو) پر حق رہے گا۔ یہی رائے ابراہیم نخعی، شعبی اور حماد بن ابی سلیمان سے بھی ثابت ہے۔

ڈاکٹر حسن ترابی کی رائے پھر سے ان کے حالیہ انٹرویو کے ذریعہ سامنے آئی ہے جو اخبار **الشرق الاوسط** کے نمائندہ کو انہو ں نے دیا ہے۔ یہ انٹرویو، جسے ۲۱ مئی ۲۰۰۶ء کے **الشرق الاوسط اخبار** کے لیے امام محمد امام نے لیا تھا اور اس اخبار کے عربی اور انگریزی ایڈیشنوں میں لندن میں چھپا ہے، اس اخبار کی ویب سائٹ پر دیکھا جا سکتا ہے:

( www.asharqalawsat.com/english/news.asp? section =3&id=4678)

یہی انٹرویو سوڈان ٹریبیون کی ۵ مئی ۲۰۰۶ء کی اشاعت میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ انٹرویو لمبا ہے اور بہت سے سیاسی اور سماجی مسائل سے تعرض کرتا ہے۔ ذیل میں صرف اپنے موضوع سے متعلق حصے نقل کیے جا سکیں گے۔

سوال: کیا آپ کا خیال ہے کہ وہ شادی شدہ عورتیں جو اسلام لائیں ایک غیر مسلم شوہر کے نکاح میں باقی رہ سکتی ہیں.....؟

جواب: ایک بار ایسا ہوا کہ ایک امریکی خاتون ایک اسلامک سنٹر میں اسلام لانے کی غرض سے گئی مگر وہ چاہتی تھی کہ اسلام قبول کرنے کے بعد بھی وہ اپنے غیر مسلم شوہر کے نکاح میں باقی رہے۔ سنٹر کے ذمہ داروں نے اس سے کہا کہ اگر وہ اپنے اسلام لانے کے ارادہ میں مخلص ہے تو اسے چاہیے کہ طلاق کی کارروائی شروع کر دے، باوجود اس کے کہ اس میں بڑا خرچہ تھا اور ڈر تھا کہ وہ اپنے بچوں کی تولّیت سے محروم ہو جائے گی۔ ان حضرات نے یہ نہ سوچا کہ ایسے افراد سے جو ابھی اسلام کی طرف پہلا قدم اٹھانے جا رہے ہوں یہ مطالبہ بہت ہی بڑا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس رویہ کی وجہ سے بہت سی عورتیں اسلام قبول کرنے سے جھجکتی ہیں۔

مجھے یہ فتویٰ دینے سے پہلے اسلامی قانون کے بارے میں خاصی ریسرچ کرنا پڑی۔ خاص طور پر

میں نے اسلامی فقہ پر بعض ایسی کتابوں کا مطالعہ کیا جو تاریخ کے بعض مخصوص ادوار میں مرتب کی گئی تھیں۔ ماضی کے سارے فتاویٰ جن میں مسلمان عورت کی غیر مسلم مرد سے شادی ممنوع قرار دی گئی تھی ایسے زمانہ میں جاری کیے گئے تھے جب مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سیاسی جھگڑے چل رہے تھے۔ دوسری طرف مجھے قرآن یا سنّت میں ایک لفظ بھی نہ ملا جو ایسی شادیوں کو ممنوع قرار دیتا ہو۔

[تنبیہ: آخر کے تین جملے الشرق الاوسط، عربی ایڈیشن (۲۱-اپریل ۲۰۰۶ء۔ عدد ۱۰۰۲۸) میں اس طرح ہیں: قدرتی طور پر میں نے اسلامی تاریخ کے ایسے ادوار کے بارے میں خاصہ مطالعہ کیا جب مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان حالات میں اضطراب تھا اور ان مسلمانوں کے حالات بھی مضطرب تھے جو غیر مسلموں کے پڑوس میں رہتے تھے اور ایام رِدّہ (کے بارے میں بھی پڑھا) جن دنوں کہ حالات میں بہت انتشار تھا۔ تب، جب کہ مجھے نہ تو کتاب (اللہ) میں نہ سنّت میں کوئی بات ملی جو مسلمان عورت کے اہلِ کتاب مرد کے نکاح میں رہنے کو ممنوع قرار دیتی ہو، میں نے یہ رائے قائم کی]

اس مخصوص واقعہ کی نسبت سے جس میں امریکہ میں ایک عورت اسلام قبول کرنا چاہتی تھی، میری رائے یہ تھی کہ اسے اپنے شوہر کے نکاح میں رہنے دیا جائے۔ ہو سکتا تھا کہ اس کی وجہ سے وہ آدمی اسلام میں داخل ہو جاتا، ہو سکتا تھا کہ بعد میں دوسری خواتین اور ان کے خاندان بھی یہی کرتے.....

ہمیں ان مسلمان اقلیتوں کو جو مغرب میں اہلِ کتاب کے درمیان رہتے ہیں اختیار دینا چاہیے کہ وہ اس مسئلہ کا جائزہ لے کر فیصلہ کریں کہ کیا طریقہ مناسب ہو گا کیوں کہ وہی اس سے اوّلین مرحلہ میں متأثر ہوتے ہیں۔ وہ اسی نتیجہ تک پہنچیں گے کہ اپنی بیٹیوں کو عیسائی اور یہودی مردوں کے ساتھ شادیاں کرنے دیں کیوں کہ غالباً یہ شادیاں ان کے شوہروں کو اسلام کی طرف لے آئیں گی، بصورت دیگر عورت خود اسلام پر قائم رہ سکے گی۔ مغرب میں انفرادی آزادی کا دائرہ عام طور پر زیادہ وسیع ہے، لوگوں کو حالات کا مطالعہ کرتے رہنا چاہئے اور مناسب طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔

یہ بات بھی سامنے رہے کہ بیس سال پہلے جب شمالی امریکہ کے معروف اسلامی ادارے **المعهد العالمي للفكر الاسلامي** نے جدّہ میں **منّظمة المؤتمر الاسلامي** کی **مجمع الفقه الاسلامي** کے سامنے یہ مسئلہ رکھا تھا تو اس نے مذکورہ بالا رائے کے برعکس معروف فقہی مسلک پر اصرار کیا تھا(۲)۔

المجلس الاوروبی للافتاء و البحوث کے ایک اور رکن نے بھی جو امریکہ میں مقیم ہیں اس موضوع پر تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے جس کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے(۳)، بعض اقتباسات ذیل میں درج ہیں:

☆ ''فقہ المقاصد ہی کی روشنی میں یہ مسئلہ بھی حل کیا جانا چاہیے کہ اگر بیوی مسلمان ہو جائے اور اس کے شوہر نے اسلام قبول نہ کیا ہو تو کیا دونوں کے درمیان تفریق کرا دی جائے گی؟(۴)

☆ ''فکر مقاصدی کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان عورت کو بچایا جائے اور ایسی عورتیں امریکی معاشرہ میں لا تعداد ہیں۔ اگر آپ یہ کہیں گے کہ اگر تم اسلام قبول کرو گی تو تمہیں شوہر کو چھوڑنا پڑے گا، اولاد کو چھوڑنا پڑے گا تو اس کا کوئی شوہر نہ ہو گا، کوئی اس کے اخراجات پورے کرنے والا نہ ہو گا، اب وہ اس سلسلہ میں اور اپنے بال بچوں کے سلسلہ میں کیا راستہ اختیار کرے گی؟ بیشتر عورتیں یا تو اسلام قبول کرکے مرتد ہو جائیں گی یا اسلام قبول ہی نہیں کریں گی..... ہم اس فتویٰ کے ذریعہ بندگانِ خدا کو اللہ کے دین سے روکنے والے ہوں گے۔(۵)

آپ نے دیکھا کہ ایک نیا موقف اختیار کرنے والوں نے کس طرح نئے حالات میں اسلام کے اس مقصد کو کہ اللہ کے بندے راضی خوشی اللہ کے دین میں داخل ہوسکیں اور ان کو اس پر قائم رہنے میں ناقابلِ برداشت مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے، فیصلہ کن اہمیت دی ہے۔

## غیر مسلم اکثریتی ممالک میں مسلمانوں کے لیے اور مسلم اکثریتی ممالک میں غیرمسلموں کے لیے، شہریت، حکومت میں شرکت اور فوج میں شمولیت وغیرہ

مسلمان صرف خدا کو حکمرانی کا سزاوار جانتا ہے اور اس کی عملی تعبیر کی شکل یہ سمجھتا ہے کہ مسلمان اللہ کی کتاب اور اس کے نبی کی سنّت کی روشنی میں کار حکمرانی کی تنظیم عمل میں لائیں جس کی آئیڈیل صورت خلافتِ راشدہ تھی۔ ایسے ماحول میں رہتے ہوئے وہ اسلامی آداب و احکام کے مطابق زندگی گزارنے میں کوئی دقت نہیں محسوس کریں گے۔ اسلامی فقہ کے ابواب زیادہ تر ایسے ہی ماحول کو سامنے رکھ کر مرتب کئے گئے ہیں اگرچہ ان میں کچھ ایسے حالات کا بھی ذکر ہے جن میں مسلمان غیرمسلموں کی عملداری میں مختلف حالات سے گزریں۔ مگر ان باتوں پر اس زمانہ کے حالات کی گہری چھاپ تھی، مثلاً انسانی معاشرہ کی قبائلی تنظیم، دار الاسلام کے بالمقابل کسی بڑی طاقت کا نہ پایا جانا، وغیرہ۔ آج کچھ ایسا ماحول ہے جس کا غیرمسلم اکثریتوں کے درمیان رہنے والے مسلمان کے لائحہ عمل پر اثر پڑنا لازم ہے۔ ہر فرد کے بنیادی حقوق کا اعتراف، شہریوں کے درمیان عدم تفریق

کا التزام، اجتماعی امور میں فیصلہ کے لیے جمہوری طریق سے وابستگی اور دنیا کے بیشتر ممالک میں مذاہب کے ساتھ یکساں رواداری اور عدم ترجیح کا سلوک، ان میں سے چند اہم باتیں ہیں۔ گزشتہ صدی کے نصفِ ثانی میں اسلامی ممالک کے آزاد ریاستوں کے طور پر ظہور، نیز دوسرے ممالک میں مسلمانوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ کے بعد اب ایک نئی صورت حال پیدا ہوگئی ہے۔

دو سو سال پہلے شمالی اور جنوبی امریکہ نیز آسٹریلیا میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی۔ یورپ میں بھی چند جگہوں کے علاوہ مسلمان برائے نام تھے۔ جب اسلامی ممالک یوروپین اقوام کے زیر نگیں ہوئے تو صورت حال بدلنے لگی اور تعلیم، ملازمت اور فوجی خدمت وغیرہ کی غرض سے ان ملکوں میں طویل اقامت کی ضرورت پڑنے لگی۔ اسلامی ممالک آزاد ہوگئے تو یہ سلسلہ اور بڑھا۔ پچھلی صدی میں یورپ، شمالی اور جنوبی امریکہ اور آسٹریلیا میں بڑی بڑی مسلم آبادیاں نمودار ہوئیں۔ شروع شروع میں ان ممالک میں جابسنے کی بڑی مخالفت ہوئی۔ ایسے فتوے صادر ہوئے جن کا منشاء لوگوں کو ان ممالک میں مستقل اقامت پذیر ہونے سے روکنا تھا۔ ان سے کہا جاتا تھا کہ ان ممالک کے شہری بن کر نہ رہ پڑیں، بلکہ کام پورا ہو جانے پر واپسی کی نیت سے رہیں۔ مگر بیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں یہ آوازیں خاموش ہوگئیں۔ ایسا ہونے میں بڑا دخل ان ممالک کے حالات کا بھی تھا جن سے لوگ 'ہجرت' کرکے مغربی ممالک کا رخ کر رہے تھے۔ بعض مسلمان اقلیتیں اپنی مظلومیت کا حوالہ دے رہی تھیں تو بعض مسلم اکثریت والے ممالک میں دیندار مسلمانوں اور اسلامی نظام کے قیام کے لیے کوشش کرنے والے اپنے اوپر ہونے والے مظالم سے پریشان تھے۔ مغربی ممالک میں مذہب کی بنیاد پر عدم تفریق کی پابند بنیادی انسانی حقوق کی ضامن، سیکولر حکومتیں ان کے لیے نہ صرف ذاتی پناہ گاہ بن کر سامنے آئیں بلکہ ان کو وہاں اپنی دینداری اور اسلامی سرگرمیوں کے لیے بھی وسیع میدان ملا۔ ایسے حالات میں یہ سن کر کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیے:

''اگرچہ اوّلینِ صحابہ کی حبشہ کی طرف ہجرت مستقل قیام یا بس رہنے کی نیت سے نہیں تھی مگر وہ ہجرت جن علاقائی اور ملکی نیز داخلی اور نفسیاتی احوال کے درمیان ہوئی تھی وہ بہت سی باتوں میں ان حالات سے مشابہت رکھتے ہیں جن سے آج مسلمانوں کو سابقہ ہے۔ ان اوّلین مسلمانوں کو جس معاشی تنگی، کمزور رکھے جانے، اجنبیو ں جیسے برتاؤ اورزبردستی دیس نکالے سے واسطہ تھا ،وہ کسی نہ کسی درجہ اس سلوک سے مماثلت رکھتے ہیں جن سے ان کے بعد میں آنے والوں، یعنی موجودہ نسل کو واسطہ پڑا، جن کے سبب ان کو اس وطنِ عزیز کو خیرباد کر کے جو انہیں راس نہ آ سکا ایسے ممالک میں جا بسنا پڑا جہاں اب بھی کچھ عدل اور صداقت باقی ہے''۔(۶)

آج جو آوازیں سنائی دے رہی ہیں وہ یہی تلقین کر رہی ہیں کہ مغربی ممالک کے مسلمان ان ملکوں کے شہری بن کر رہیں۔ شہریت کے تمام حقوق سے فائدہ اٹھائیں اور شہریت کے تمام فرائض ادا کریں۔ آج کی شہریت اسی طرح ہے جیسے آغازِ اسلام میں کسی قبیلہ سے وابستگی۔ وہ کل کا عرف تھا، یہ آج کا عرف ہے۔ مسلمانوں نے جس طرح قبائلی دور کے معروفات کو اسلام کے حق میں استعمال کیا اسی طرح انہیں آج کی ریاستوں کے معروفات کو اسلام کے مفاد میں استعمال کرنا چاہئے۔ علامہ یوسف قرضاوی، شیخ راشد الغنوشی.....وغیرہ علماء اور دانشوروں کی انفرادی آوازوں کے علاوہ یہی فتویٰ المجلس الاوروبی للافتاء والبحوث کا بھی ہے۔

المجلس الاوروبی للافتاء والبحوث کے رکن اور برطانیہ کی فتویٰ کمیٹی کے جنرل سکریٹری، سالم الشیخی کہتے ہیں:

''مغربی ممالک میں رہنے والے مسلمان سیاست میں حصہ لینے کے بارے میں بنیادی طور پر تین مراحل سے گزرتے ہیں۔ پہلا مرحلہ بحث و مباحثہ اور فقہی تحقیق کا ہے کہ یورپ میں مسلمانوں کا سیاست میں حصہ لینا کیسا ہے۔ کتنے ہی فتوے ہیں جن کا آج بھی حوالہ دیا جاتا رہتا ہے کہ مسلمانوں کو یورپ میں سیاست سے دور رہنا چاہئے۔ ہم اس مرحلہ سے تقریباً گزر چکے ہیں۔ دوسرا مرحلہ عملاً سیاست میں حصہ لینے کا ہے۔ اس کام کو اب بھی صورت حال کے صحیح فہم اور سیاسی کارکنوں کی تائید کرنے والے شرعی فتاویٰ کی ضرورت ہے۔ تیسرا مرحلہ جو فی الواقع ہنوز آنا باقی ہے، ایسے سیاسی رسوخ کا ہے جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کو سیاسی وزن حاصل ہو سکے اور وہ ایسے حلقوں کی تائید کر سکیں جو یورپ میں مسلمانوں کے مسائل حل کرنے میں مددگار ہوں.....''(۷)

مغربی ممالک کی شہریت حاصل کرنے کا مسئلہ اس سے پہلے ۱۹۹۲ء میں فرانس میں منعقد ہونے والے ایک فقہی سیمینار میں بھی زیرِ غور آیا تھا۔ اس سیمینار میں اکابر علماء، شیخ مصطفیٰ زرقاءؒ، شیخ عبدالفتاح ابو غدہؒ اور شیخ یوسف قرضاوی وغیرہ شریک تھے۔ ڈاکٹر سیّد درشؒ کے تیار کردہ انگریزی خلاصہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت تک فرانس جیسے ملکوں میں پایا جانا خود ایک مسئلہ تھا، اگرچہ یہ بات سمجھی جا چکی تھی کہ وہاں مسلمانوں کا وجود عارضی نہیں رہا، اور اس وجود کے مسائل کو مستقبلِ بعید کے امکانات کو سامنے رکھتے ہوئے زیرِ غور لانا ہو گا۔ چنانچہ مجلس نے اس بارے میں ایجابی موقف اختیار کیا۔ ہمیں معلوم نہیں کہ بحث و مذاکرہ میں مقاصد، شریعت کا حوالہ دیا گیا یا نہیں، مگر مستقبل کے دعوتی امکانات اور فی الجملہ ایک مثبت رول ادا کرنے کی تاکید اسی طرف لے جاتی ہے۔(۸)

مشہور اسلامی دانشور اور مصنف، طارق رمضان نے شہریت سے وابستہ فرائض کی ادائیگی کو، جن فرائض میں سب کے ساتھ مل کر عدل انصاف کے لیے جدوجہد سرِفہرست ہے، ایک دینی تقاضا قرار دیا ہے۔(۹) ایک دوسرے صاحب فکر، احمد صدقی دجانی نے ۲۰۰۲ء میں جرمنی میں جاری کیے جانے والے اسلامی چارٹر پر تبصرہ کرتے ہوئے اسی رائے کا اظہار کیا ہے۔(۱۰) تونس کی اسلامی تحریک کے رہنما اور مشہور صاحب فکر، راشد غنوشی نے اس مسئلہ پر عمومی حیثیت سے گفتگو کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

''مسلمانان عالم کی تقریباً ایک تہائی تعداد اپنے ممالک میں اقلیت کے طور پر رہتی ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ مستقبل قریب میں اس کی امید نہیں کر سکتے کہ ان پر اسلام کے مطابق حکمرانی کی جائے، اس کے برعکس ان میں سے بہتوں کو اس خطرہ کا سامنا ہے کہ ان کو مٹانے کی کوشش کی جائے یا ان کے خلاف تعصب برتا جائے۔ اب سوال یہ ہے کہ فقہ اسلامی کے پاس ان کے لیے کیا امکانات ہیں؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ایسوں کو قریب ترین اسلامی ملک میں ہجرت کرکے چلے جانا چاہئے۔ اکثر اوقات یہ ممکن ہی نہیں، اگر یہ ممکن ہو تو بھی سوال یہ ہے کہ کیا یہ مفید ہو گا؟ یہ تو ایک ایسا تباہ کن راستہ معلوم ہوتا ہے جسے دشمنان اسلام، اپنی کوششوں کے ضمن میں پیش کرتے ہیں۔ بعض دوسرے یہ کہتے ہیں کی ایسی حالت میں مسلمانوں کو (نظام حکومت سے) کنارہ کشی کر کے (حالات بدلنے کا) انتظار کرنا چاہئے، مگر یہ تجویز اس ایجابی اور حرکی رویہ سے نہیں میل کھاتی جس کی اسلام اپنے پیروؤں سے توقع کرتا ہے۔

ایسے لوگوں کے لیے بہترین راستہ یہ ہے کہ وہ سیکولر جمہوری جماعتوں کے ساتھ مل کر ایک ایسے سیکولر جمہوری نظام کے قیام کے لیے جدّوجہد کریں جس میں انسانی حقوق کا احترام کیا جائے، جن حقوق میں کہ وہ ضروری مصالح شامل ہیں جن کے تحفظ کے لیے اسلام آیا ہے، مثلاً جان، عقل، نسل، مال، آزادی اور خود دین، جس میں ان سوسائٹیوں میں مسلمانوں کے عقیدہ، مذہبی شعائر اور پرسنل لاز کا تحفظ شامل سمجھا جاتا ہے.....''(۱۱)

شیخ راشد غنوشی کے نزدیک مسئلہ یہ نہیں کہ اقلیتی ممالک کے مسلمانوں کے لیے ایسا کرنا جائز ہے۔ وہ مقاصد شریعت کی روشنی میں کہتے ہیں کہ ایسا کرنا واجب ہے:

''یہ جان لینے کے بعد کہ اسلامی حکومت کا مقصود تمام انسانی مقاصد کو ایک ساتھ حاصل کر دکھانا ہے، جب ایسا کرنا ممکن نہ ہو تو اصول استطاعت کے مطابق، واجب ہو گا کہ جس قدر حاصل کرنا ممکن ہو اسی کے حصول کی کوشش کی جائے۔ یعنی ہم اسی قدر مکلّف ہیں جتنی ہم میں استطاعت ہو۔

اب بھلا ایسے حالات میں کوئی اسلامی گروہ مشترکہ جدوجہد سے کیسے پیچھے ہٹ سکتا ہے جب کہ ہمارے بس میں ہو کہ دوسرے گروہوں کے ساتھ مل کر، قطع نظر اس کے کہ وہ گروہ مسلم ہیں یا غیر مسلم، ایک ایسا اجتماعی نظام قائم کرنے کی کوشش کریں، جو اگرچہ شریعت پر نہ قائم ہو مگر شریعت کے اساسی قواعد میں سے ایک قاعدہ یعنی شوریٰ پر مبنی ہو، یعنی اس اصول پر کہ اقتدار جمہور کا ہے، جس (اشتراک عمل) کے ذریعہ کہ کسی شر، جیسے ڈکٹیٹر شپ پر مبنی حکومت، یا غیر ملکی تسلّط، یا مقامی افرا تفری، یا بھک مری کا ازالہ مطلوب ہو۔ یا جس کے ذریعہ کسی اہم ملکی اور انسانی مصلحت مثلاً آزادیٔ وطن، یا ملک کی معاشی ترقی اور اس کا اتحاد، یا عام لوگوں یا کسی خاص گروہ کے لیے سیاسی حقوق کی ضمانت حاصل کرنا مقصود ہو جیسے انسانی حقوق، سیاسی پلورلزم، عدلیہ کی خود مختاری، صحافت کی آزادی، مساجد کی آزادی اور دعوت و تبلیغ کی آزادی۔ جن حالات میں ایک جمہوری اسلامی نظام کا قیام ناممکن ہو ان حالات میں ایک ایسے سیکولر جمہوری نظام کے قیام کی کوششوں میں حصہ لینے سے کیسے باز رہا جا سکتا ہے؟ بقول ابن خلدون(۱۲) اگر شرع کی حکمرانی ناممکن ہو تو عقل کی حکمرانی قائم کی جائے۔ اشتراک عمل سے دوری ہرگز مناسب نہیں۔ بلکہ واجب شرعی ہے کہ مسلمان ایسے نظام کے قیام کی کوشش میں انفرادی اور اجتماعی طور پر شرکت کریں۔ ایسا کرنا ان اصولوں اور مقاصد شریعت کی روشنی میں لازم آتا ہے جن کا اوپر ذکر آچکا ہے، جن کا جوہر ہے مصالح اور مفاسد کا موازنہ کرکے فیصلہ کرنا۔ وہ اصول بھی اس صورت حال پر منطبق ہے جس کا تعلق ضرورت اور استطاعت سے ہے، نیز شریعت کے وہ اصول بھی سامنے رہیں جن میں نتائج و عواقب کی روشنی میں فیصلہ کرنے پر زور دیا گیا ہے۔''(۱۳)

نئے حالات میں اسلام اور مسلمانوں کے مجموعی مفادات و مصالح، نیز انسانیت کے عمومی اور طویل المیعاد مسائل کے حل کے لیے سوچنے میں مقاصد شریعت کا یہ حوالہ سبق آموز ہے۔

## فوجی خدمت کا مسئلہ

غیر مسلم اکثریتی ممالک کے مسلمان شہریوں کے لیے ایک نازک مسئلہ ملکی فوج میں ملازمت کا ہے۔ عام حالات میں بھی اس کا جواز یا عدم جواز موضوع بحث رہا ہے، مگر حال میں اس کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ اکثر اوقات اس سے ان مسلمان فوجیوں کو مسلمانوں کے خلاف لڑنے کی آزمائش کا سامنا ہو سکتا ہے۔ ہمارے موضوع کے اعتبار سے نوٹ کرنے کی بات یہ ہے کہ موجودہ حالات میں ان نزاکتوں کے باوجود ضروری سمجھا گیا کہ غیر مسلم اکثریتی مملک کے

مسلمان اپنے ملک کی فوج میں شامل ہوں اور وہ جملہ فرائض ادا کریں جو اس سے وابستہ ہوں۔

۲۷ ستمبر ۲۰۰۱ء کو امریکی فوج میں ملازم، محمد عبد الرشید، کے سوال کا جواب دیتے ہوئے علّامہ یوسف قرضاوی اور ان کے ساتھ فتویٰ کمیٹی کے دوسرے ممبران نے جو کچھ فرمایا اس کو تفصیل سے دیکھا جا سکتا ہے۔ بعض اقتباسات درج ذیل ہیں:

'' مسلمان فوجیوں کو دوسرے مسلمانوں پر فوج کشی کرنے سے جو حرج واقع ہوتا ہے اس کی جڑ یہ ہے کہ لڑائی میں یہ ممکن نہیں کہ اصل مجرم جن کو ان کے کئے کی سزا دینا مقصود ہے، ان کے اور بے گناہ لوگوں کے درمیان تمیز برتی جا سکے جن کا جو کچھ ہوا اس سے کوئی تعلّق نہیں۔ ناممکن نہیں تو ایسا کر سکنا دشوار ضرور ہے۔ نبی ﷺ کی صحیح حدیث میں آیا ہے: جب دو مسلمان شمشیر بکف آمنے سامنے ہوں اور ان میں سے ایک دوسرے کو قتل کردے تو قاتل اور مقتول دونوں جہنّم میں جائیں گے۔ پوچھا گیا، قاتل کی حد تک تو بات سمجھ میں آئی مگر مقتول (کیوں جہنّم میں جائے)؟ فرمایا: اس نے اپنے بھائی کو قتل کرنا چاہا تھا۔ [بخاری اور مسلم نے روایت کیا]

اس حدیث شریف کا تعلق اس صورت حال سے ہے جب مسلمان اپنے فیصلہ میں آزاد ہو، اس کے لیے ممکن ہو کہ چاہے تو لڑے اور نہ چاہے تو نہ لڑے۔ مذکورہ حدیث ایسے حالات پر منطبق نہیں ہوتی جن میں مسلمان ایک شہری ہو اور ایک مملکت کی باضابطہ فوج میں سپاہی ہو۔ اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ جو احکام صادر کئے جائیں ان کی تعمیل کرے۔ ایسا نہیں کرے گا تو اپنے ملک سے اس کی وفاداری مشکوک قرار پائے گی اور اس سے اس کے حق میں متعدد نقصان دہ عواقب رونما ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے لیے شہریت کے حقوق سے فائدہ اٹھانا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہ اس سے وابستہ ذمہ داریاں نہ ادا کرے۔

معلوم ہوا کہ مذکورہ بالا صحیح حدیث کے متن میں اور اس جیسی دوسری احادیث میں، جس حرج کا ذکر ہے وہ یا تو دور ہو جاتے ہیں یا ان اجتماعی نقصانات کے پیش نظر قابل معافی قرار پاجاتے ہیں جو امریکی فوج کے تمام مسلمان سپاہیوں کو پہنچ سکتے ہیں، بلکہ امریکہ میں بسنے والے تمام مسلمانوں کو پہنچ سکتے ہیں۔ کیوں کہ ان کی اپنے اس ملک سے وفاداری ہی مشتبہ ہو جائے گی جس کی شہریت لے کر وہ اس ملک میں جملہ حقوق شہریت سے مستفید ہو رہے ہیں (اور جن کے تقاضے میں) انہیں چاہیے کہ شہریت کے جملہ فرائض بھی ادا کریں۔''

اس فتویٰ میں (آگے کی عبارت میں جو نقل نہیں کی گئی ہے) مقاصد شریعت کا لفظ نہیں استعمال ہوا ہے۔ اس کی جگہ قواعد شرعیہ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ دونوں کے درمیان گہرا ربط ہے، جیسا کہ پہلے واضح کیا جا چکا ہے۔(۱۴)

بات صرف ان نقصانات تک محدود نہیں جن کا ذکر اوپر نقل کیے گئے فتویٰ میں آیا ہے۔ جن ملکوں میں مسلمان اقلیت میں ہونے کے باوجود تعداد میں بہت زیادہ ہیں ان میں ان کے فوج میں ہونے نہ ہونے کا ان کے تحفظ، جان و مال کے اور دین و ملت دونوں کے تحفظ، پر گہرا اور دور رس اثر پڑتا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کا یہی حال ہے، چنانچہ ہندوستان کے مسلمان علماء اور دانشوروں نے فوج اور پولیس میں مسلمانوں کی نمائندگی کے مسئلہ کو اہمیت کے ساتھ اٹھا رکھا ہے۔

ہمارے موضوع کے اعتبار سے نوٹ کرنے کی بات یہ ہے کہ کس طرح ایک مسئلہ جب تک کسی فرد واحد کی روزی روٹی کے مسئلہ کے طور پر دیکھا جاتا رہا تو فتویٰ یہ رہا کہ فوج میں ملازمت سے دور رہو، جب (امریکی) فوج میں مسلمان سپاہیوں کی تعداد ہزارہا ہزار ہو گئی اور فوجی خدمت کو شہریت کے حقوق و فرائض سے مربوط کیا گیا تو فتویٰ جواز میں بدل گیا۔ پھر ہندوستانی مسلمانوں کے سیاق میں جب فوج اور پولیس میں مسلمانوں کی نمائندگی کو مسلمانوں کے مفادات و مصالح کے پس منظر میں دیکھا گیا اور اس ملک میں اسلام اور مسلمانوں کے طویل المیعاد مستقبل کے لیے اس کی اہمیت پر غور کیا گیا تو مسئلہ کی نوعیت یکسر بدل گئی۔ اب سوال جواز یا عدم جواز کا نہیں، مطالبات اور مہم جوئی کا ہو گیا۔ اس مقالہ کے مزاج اور حدود کے پیشِ نظر ہمارا مرکزِ توجہ نہ تو زیرِغور مسئلہ ہے نہ اس کے بارے میں اوپر نقل کی گئی آراء۔ قابلِ توجہ یہ بات ہے کہ ایک ہی مسئلہ کے بارے میں مختلف حالات میں مختلف موقف ا ختیار کئے جاتے رہے ہیں، اور ایسا مقاصدِ شریعت کی رہنمائی میں کیا گیا ہے۔

## مسلم اکثریتی ممالک کے غیر مسلم شہری

ابھی تک اسلامی ریاست کے غیر مسلم باشندوں کو، قدیم فقہی اصطلاح کی پابندی کرتے ہوے، ذمّی کہا جاتا رہا ہے اور سارا زور اس پر رہا ہے کہ یہ دکھایا جائے کہ اسلامی ریاست میں اہل ذمّہ کو بڑے حقوق حاصل ہوں گے۔ مگر زور بیان سے یہ حقیقت نہیں چھپ سکی کہ ذمّی کا درجہ شہری سے مختلف ہو گا۔ ظاہر ہے یہ مختلف درجہ شہریت سے اوپر کوئی درجہ تو نہیں ہو سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح دنیا کی دارالحرب اور دار الاسلام کے درمیان تقسیم ایک عملی ضرورت کی علمی تعبیر تھی نہ کہ الٰہی سند

رکھنے والی دائمی تقسیم، اسی طرح کسی اسلامی حکومت کے باشندوں کے درمیان (جو اکثر و بیشتر نہ صرف پیدائشی بلکہ پشتینی طور پر اسی ملک کے باشندے ہوں) کوئی تقسیم جو اسلام کی ابتدائی صدیوں میں کی گئی اور فقہ کی کتابوں میں جگہ پاگئی، دائمی حیثیت نہیں رکھتی۔ یہ تقسیم بھی علماء کی طرف سے ایک زمینی حقیقت، ایک امر واقع، کی علمی تعبیر تھی۔ آج ہزار برس بعد زمینی حقائق بدلے ہوئے ہیں اور ان کے فہم وتعبیر کی نئی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ ان کوششوں کا پس منظر یہ ہے کہ اسلام انسانوں کے دنیوی حقوق کے بارے میں دین کی بنیاد پر کوئی تفریق نہیں برتتا اور شہریت کا موضوع ایسے ہی حقوق ہیں۔ تمام بنیادی انسانی حقوق کی ضمانت ہر فرد بشر کو حاصل ہے۔ اس ضمانت کا تعلق اس امتحان و آزمائش سے ہے جس کے لیے ہم بنائے گئے ہیں کیونکہ اس کے بغیر آزادانہ فیصلہ و اختیار ممکن نہیں رہتا۔ رہی غلط فیصلہ کی سزا تو اس کا وقت آخرت کی زندگی ہے، سو اختیار کے اخلاقی عواقب ضرور دنیا میں بھگتنے پڑیں گے مگر اسلام کسی کو امتحان زندگی میں ناکام ہونے کے سبب بنیادی حقوق سے نہیں محروم کرتا۔ غور کیجئے تو یہی تقاضائے حکمت ہے کیونکہ رحمت ایزدی نے آدمی کو اس کی آخری سانس تک حسن اختیار کا موقع دیا ہے۔

اسلامی ملک میں غیرمسلم شہری کے حقوق کی تعبیر نو کا ایک بڑا محرک غیر اسلامی ملکوں میں مسلمان شہری کے حقوق ہیں۔ یہ بات انسان کی بنیادی اخلاقی حس کے خلاف ہے کہ ساری دنیا میں مسلمان ہر طرح کے حقوق چاہیں اور جہاں ان کا اقتدار ہو وہاں غیرمسلم باشندوں کو اسلام کے نام پر انہی جیسے حقوق سے محروم کریں۔ اخلاقی معیار اور عدل و انصاف کے پیمانے سب کے لیے یکساں ہیں۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ یہ اصول ہمیں تب یاد آیا جب کہ اسلامی دنیا کے باہر سو سے زیادہ ملکوں میں مسلمانوں کا وجود امر واقع بن کر سامنے آیا اور مسلم دنیا میں بسنے والے دنیا کی مسلم آبادی کے ساٹھ فیصد لوگوں کے مفادات و مصالح کو غیرمسلم دنیا میں بسنے والے چالیس فی صد مسلمانوں کے مفادات و مصالح سے مربوط کرکے دیکھا گیا۔ آج جب شیخ یوسف قرضاوی کہتے ہیں کہ 'سارے فقہاء اہل ذمہ کو اہل دار الاسلام شمار کرتے ہیں جس کے معنی آج کی زبان میں شہری ہونا ہے' تو اس کی پشت پر یہی ادراک ہے، اسی وجہ سے وہ دعوت دیتے ہیں کہ 'غیرمسلمین کے مسائل پر (پھر سے) غور کیا جانا چاہیے اور حالات کی تبدیلی کی رعایت ملحوظ رکھتے ہوئے دانشمندانہ راستہ اختیار کرنا چاہئے۔(۱۵) بعض دانشوروں نے یہ بھی کہا ہے کہ مسلم ممالک کی غیرمسلم اقلیتوں نے مغربی اقوام کی حکمرانی کے دور میں آزادی کی جدو جہد میں جو شرکت کی اسے بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔(۱۶) جیسا کہ آگے ذکر کیا جائے گا اس طرح کی باتیں اور بھی ہیں جن کا لحاظ ضروری ہے، اہم چیز اس بات کا

شعور ہے کہ نئے حالات ایک نئے موقف کا تقاضا کرتے ہیں جن کو پورا کرنے کے لیے مقاصد شریعت کی طرف رجوع کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ یہ مثالیں ہمیں بتاتی ہیں کہ مقاصد شریعت نیا موقف اختیار کرنے میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔

## عورت کی سربراہی

اسلامی تاریخ میں عورت کی حکمرانی کی بعض مثالوں کے علی الرغم، فقہ یہی کہتی رہی کہ اسلامی ملک میں سربراہ حکومت مرد ہونا چاہئے۔ مگر ۱۹۶۲ء میں پاکستان میں ایوب خان کے مقابلہ میں صدارتی انتخاب لڑنے کے لیے علماء کی ایک معتدبہ جماعت نے فاطمہ جناح کو چنا جن کی کامیابی کے امکانات تھے۔ ان علماء میں دیوبندی مکتب فکر کے اکابر میں سے مولانا مفتی محمد شفیع اور دوسرے مکاتب فکر کے ممتاز علماء شامل تھے۔(۱۷)

صورت حال کا اندازہ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کے ان الفاظ سے کیا جا سکتا ہے: ''مجھے یقین ہے کہ اگر اس انتخاب میں فاطمہ جناح کی تائید نہ کی گئی تو یہ آمریت پھر مسلط ہو جائے گی۔ اس کا مسلّط ہونا میرے نزدیک عورت کو سربراہ بنانے کی بہ نسبت کم از کم دس گنا زیادہ بڑا گناہ ہے۔(۱۸)

شیخ راشد نے اپنی کتاب؛ **المراۃ بین القرآن الکریم و واقع المسلمین** (۱۹) میں اس مسئلہ پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ ان کی رائے میں مسلمان عورت کو سیاست میں حصہ لینا چاہئے اور اس کے مناصب حکومت پر فائز ہونے میں کوئی حکم شرعی مانع نہیں۔ ان مناصب میں صدر مملکت کا عہدہ بھی شامل ہے۔ اپنی رائے کی تائید میں انھوں نے ڈاکٹر عبداللہ درازؒ، سیّد قطبؒ، شیخ محمد الغزالیؒ اور شیخ یوسف قرضاوی وغیرہ کے حوالے بھی دیے ہیں۔ ہمارے لیے نوٹ کرنے کی بات یہ ہے کی اس ضمن میں 'مقاصد اسلام' کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔(۲۰)

## عورت کا سماجی کردار

مذکورہ بالا مسئلہ کے ذیل میں ان مباحث پر ایک نگاہ ڈال لینا مناسب ہو گا جو اجتماعی زندگی میں مسلمان عورت کی حصہ داری اور سرگرمی سے متعلق ماضی قریب میں برابر اٹھتے رہے ہیں، اس مقالہ کے موضوع کی مناسبت سے ہمیں ان مباحث پر خود رائے زنی سے نہیں بلکہ اس بات سے دلچسپی ہے کہ مسلمان علماء اور دانشور اِن مسائل سے کس طرح عہدہ برآ ہو رہے ہیں، ان کی سوچ میں مقاصد شریعت کے ادراک کی کیا اہمیت ہے؟ یہ بات بھی سمجھنے کی ہے کہ عرصہ دراز کے بعد ان مسائل کے زور شور سے اٹھنے کی وجہ کیا ہے۔

جہاں تک عورت کے سماجی کردار کا تعلق ہے، صدیوں سے وہ عالم اسلامی کے مختلف علاقوں میں مختلف رہا ہے، بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ایک ہی علاقہ میں مختلف طریقے اختیار کئے جاتے رہے جیسا کی حکمرانی کے مسئلہ میں ہم نے پچھلے صفحات میں بتایا۔ ہندوستان میں ذات پات کے نظام، ستی کے رواج اور شوہر کو بے چون و چرا اطاعت کا مستحق قرار دینے کا جو ماحول تھا اس کا یہاں کی مسلم معاشرت پر بہت گہرا اثر پڑا۔ یہا ں تک کہ بعض ایسے طور طریقے بھی رواج پا گئے جو اسوۂ نبوی کے سراسر خلاف تھے، مثلاً عورتوں اور مردوں کا ساتھ بیٹھ کر کھانا نہ کھانا، عورتوں کو سلام نہ کرنا، یا ان کے سلام کا جواب نہ دینا، عورتوں کو مساجد میں نہ آنے دینا، وغیرہ۔ یہ مقامی عرف و عادات تھے جنہیں دانستہ یا نادانستہ مسلم معاشرہ نے بھی اپنا لیا۔

نو آبادیاتی نظام کے خاتمہ اور مسلمان ملکوں کی آزادی کے بعد مختلف وجوہ سے صدیوں سے قائم عرف و عادت کو بدلنے کا داعیہ نمودار ہوا۔ عورتوں میں خواندگی بڑھی اور اعلیٰ تعلیم بھی عام ہونے لگی۔ ملکوں کا نظم و انصرام اہل ملک کے ہاتھ میں آیا، مجالس قانون ساز بنیں اور ان میں عورتوں کی نمائندگی کا مسئلہ سامنے آیا۔ نجی دائرہ میں تجارت و صنعت نے فروغ پکڑا اور یہ ممکن ہوا کہ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کی طرح مسلمان ممالک میں بھی عورتیں پیداواری عمل میں حصّہ لیں۔ تعلیم کے لیے اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں قائم ہوئیں، صحت عامّہ کا دائرہ وسیع ہوا، عورتوں کے لیے ذاتی پریکٹس، ملازمت، یا شراکت داری کے کاموں کے وسیع امکانات سامنے آئے۔ جیسا کہ شیخ راشد غنوشی نے اپنی محولہ بالا کتاب میں رقم کیا ہے، گزشتہ صدی کے نصف آ خر میں اسلامی تحریکات کی سرگرمیوں میں عورتوں نے فعّال حصہ لیا جس سے مسلمان عورت کے سماجی رول کا دائرہ وسیع ہوا۔(۲۱)

ابھی ان نئے عوامل کے اثر سے پرانی عادات و اعراف اور ان کے مطابق فتاویٰ کے بدلنے کا سلسلہ جاری تھا کہ مغربی ممالک میں قابل لحاظ مسلمان آبادیاں نمودار ہوئیں۔ ان آبادیوں کا ایک عنصر اپنے ساتھ اپنے اصل وطن کے عرف و عادات ساتھ لایا تھا تو دوسرا عنصر وہ بھی تھا جو ان مغربی ممالک ہی میں پیدا ہونے اور اسی ماحول میں پروان چڑھنے کے سبب انہی مقامات کے عرف و عادات سے مانوس تھا۔ لباس، وضع قطع، کھانے پینے کے آداب، رہن سہن، ملنے جلنے کے طور طریقے، خوشی اور غم میں ایک دوسرے کا ساتھ دینے کے آداب وغیرہ معاشرتی امور جن سے اللہ کی کتاب میں تعرض نہیں کیا گیا ان میں ان لوگوں کو اسلامی ملکوں سے ہجرت کرکے آئے مسلمانوں کے نمونے راس نہیں آئے۔ نئے موقف اختیار کرنے کی ضرورت پڑی۔

مغربی ممالک میں عورتیں عام طور پر سر نہیں ڈھانپتیں جب کہ مشرق میں غیر مسلم اقوام میں بھی سر ڈھکنے کا رواج رہا ہے۔ اس بارے میں کوئی واضح حکم نہیں، چنانچہ جس آیت قرآنی میں عورت کے لباس کا ذکر ہے۔(۲۲) اس میں 'خمار' کو سینے پر ڈالنے کو کہا گیا ہے۔ خمار کے معنی اوڑھنی کے ہیں۔ عام طور پر اردو میں ترجمہ کرنے والوں کا کہنا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اوڑھنی سر پر ہوتی ہوئی سینہ تک لائی جائے۔ دوسری آیت جس میں ازواج مطہرات کو گھر سے باہر نکلنے میں 'جلباب' نیچے کر لینے کہ ہدایت ہے، اس میں اس کی حکمت یہ بتائی گئی ہے، ' پہچان لی جائیں تاکہ کوئی انھیں تنگ نہ کرے'(۲۳) ڈاکٹر حسن ترابی کے نزدیک حجاب کا حکم ازواج مطہرات کے لیے تھا، مسلمان عورتوں کے لباس سے حجاب کے لفظ کا کوئی تعلّق نہیں جس کا ذکر سورۂ احزاب آیت ۳۵ میں ہے۔ مسلمان عورتوں کے لباس سے تعلّق 'خمار' کا ہے(۲۴)۔ معروف نومسلم دانشور مراد ہو فمان مترجم قرآن محمد اسد کے حوالہ سے عورت کے سر ڈھانکنے کو عرب کے موسم کے سیاق میں پا یا جانے والا ایک رواج قرار دیتے ہیں جس کی پابندی مغرب میں رہنے والی مسلمان عورت کے لیے ضروری نہیں۔(۲۵ ) فرانس، چند دوسرے یورپین ممالک اور ترکی کی حکومتوں کی سخت گیر پالیسیوں کی وجہ سے مسئلہ حجاب نے اتنا طول کھینچا ہے کہ بعض نام نہاد (غیر مسلم) دانشور اسے اسلام اور مغربی تہذیب کے اس ٹکراؤ کا نمونہ سمجھنے لگے ہیں جس کی بات سیموئل ہنٹنگٹن نے چلائی ہے۔ ایسی حالت میں یہ رائے وزن اختیار کرتی جارہی ہے کہ اس فروعی اور اختلافی مسئلہ پر محاذ آرائی اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ہے۔ یہ بھی مقاصد شریعت کی روشنی میں کسی رائے تک پہنچنے کی ایک مثال ہے۔ جیسا کہ شاہ ولی اللہ نے واضح کیا ہے(۲۶)، بہت سے امور میں شرعی احکام اس قوم کی عادت اور عرف پر مبنی ہوتے ہیں، جن کے درمیان نبی بھیجا جاتا ہے۔ یہ ایک قدرتی اور حکیمانہ بات ہے، مگر اس کا تقاضا بنتا ہے کہ جہاں عرف و عادت مختلف ہوں وہاں کے لیے اصلِ دین اور مقاصدِ شریعت کو سامنے رکھ کر سوچا جائے۔

## ناقص یا نامکمل معلومات کی روشنی میں فیصلہ طلب امور پر غور کے تقاضے

جینی علوم genetic sciences نسبتاً نئے علوم ہیں جن کی روشنی میں دوسرے امکانات کے ساتھ بعض امراض کے علاج یا ان کو روکنے کی تدابیر کا انکشاف ہو رہا ہے۔ مقاصدِشریعت مین حفظ جان اور حفظِ نسل کو اونچے مقام حاصل ہیں۔ سوال یہ ہے کہ مسلمان genetic engineering سے کس حد تک مستفید ہو سکتے ہیں۔ اس اہم سوال پر ملایا یونیورسٹی، کوالالمپور کی ھدیٰ ہلال نے قلم اٹھایاہے۔(۲۷) ان کی بحث کے چند نتائج درجِ ذیل ہیں:

کلوننگ کے بعض ممکنہ مفید استعمالات کے باوجود اس کے مفاسد کا پلّہ بھاری ہے، اسے حرام قرار دینا ہو گا۔

امّت کو human genome پروجکٹ میں بھرپور حصّہ لینا چاہئے کیوں کہ اس سے متعدّد علمی اور عملی فوائد وابستہ ہیں، جن کا تعلّق جان، نسل اور عقل کے تحفظ سے ہے۔ البتہ ڈی این اے ریسرچ کے نتیجہ میں نکلنے والے نئے طریقِ علاج چونکہ ابھی زیادہ تر تجرباتی دور سے گزر رہے ہیں اس لیے احتیاط لازم ہے۔ وہ لکھتی ہیں: 'ان نئے طریقوں سے متعلق حکمِ شرعی طے کرنے میں تجربات کے نتائج سامنے آنے تک انتظار مناسب ہو گا۔ اگر کچھ ناگوار نتائج بھی سامنے آتے ہیں اور ساتھ ہی بعض انسانی مصالح کی تحقیق بھی متوقع ہو تو اس قاعدہ کا سہارا لینا مناسب ہو گا جس کے مطابق مصلحتِ راجحہ کو مفسدۂ مرجوحہ پر مقدم رکھنا چاہئے۔ اس ریسرچ کا حاصل یہ ہے کہ دنیا میں مقاصدِ شریعت کی تحصیل اور مطلوبہ خلافت برپا کرنے کی خاطر ان علوم میں مہارت اور ان پر عبور حاصل کرنا واجب ہے۔'(۲۸)

جینیٹک انجینئرنگ اور کلوننگ وغیرہ مسائل پر کچھ فتوے بھی آئے ہیں (۲۹)۔ مذکورہ بالا اقتباس کو پیش کرنے کا مقصد جدید مسائل کی ایک مخصوص قسم کی طرف توجہ مبذول کرانا ہے۔ اس قسم کی پہچان یہ ہے کہ ابھی تک کسی کو بھی ان کی ماہیت کا مکمل علم نہیں، نہ ان سے متوقع منافع کا یا ان نقصانات کا ٹھیک اندازہ لگانا ممکن ہے جو ان کو اختیار کرنے کے نتیجہ میں اٹھانے پڑ سکتے ہیں۔ پھر بھی ہم ان سے متعلق کوئی موقف اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ قسم صرف سائنٹیفک امور اور ٹکنالوجی کے دائرہ میں محصور نہیں، زندگی کے دوسرے دائروں میں بھی اس سے سابقہ پڑ رہا ہے۔ اقتصادیات اور مالیات میں اس کی ایک نمایاں مثال hedge funds کی ہے(۳۰)۔ ظاہر ہے کہ جہاں نہ تو ماہیت پر اتفاق ممکن ہو نہ مصالح اور مفاسد کے موازنہ پر وہاں حکم شرعی طے کرنے میں بھلا کیسے اختلاف نہ ہو گا۔

پندرہ برس پہلے hedge funds میں سرمایہ کاری برائے نام تھی۔ مگر آج کل یہ مالیاتی بازار میں نفع آور سرمایے کاری کا ایک بڑا ذریعہ ہے جس میں تقریباً ڈیڑھ ہزار بلین ڈالر کا سرمایہ لگا ہوا ہے۔ مگر اس کی افادیت کے بارہ میں ماہرین کی رائیں مختلف ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ سرمایہ کے بازار کی کارکردگی بڑھاتا، اس میں مزید سہولت liquidity پیدا کرتا اور عدم تیقّن اور خطر سے عہدہ برآ ہونے کا ایک فعّال طریقہ ہے مگر بعض دوسرے ماہرین اس کی اس خوبی کے قائل نہیں ہیں۔ اسلامی

مالیاتی بازار میں بھی رائیں مختلف ہیں اور عمل بھی۔ ایک طرف اسلامی ہیج فنڈ جاری کرنے کا اعلان ہے۔ جس کی پشت پر بعض علماء شریعت کی سند بتائی جاتی ہے تو دوسری طرف اس طریقہ پر نکیر ہے۔ (حاشیہ نمبر ۳۰ میں دئے گئے حوالوں کی مدد سے ان رایوں کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے)۔

## بدلتے حالات میں بدلتے ہوے فتوے

اب ہم بعض ایسے فتووں کا ذکر کریں گے جن میں حالات کی تبدیلی کے ساتھ تبدیلی کی جاتی رہی ہے اور بہر صورت مصالح و مقاصد ہی پیشِ نظر رہے ہیں۔ ان فتووں کا تعلّق ملیشیا کی اسلامی امور سے متعلّق نیشنل کونسل کی فتویٰ کمیٹی سے ہے(۳۱)۔ پہلا مسئلہ مسلمان مردوں کے کتابیہ عورتوں سے نکاح کا ہے۔ ۱۹۷۵ء میں اس مجلس نے کہا تھا کہ:

'مجلس اس بات پر متفق ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم عورت عیسائی ہو جائے اور کوئی مسلمان مرد اس سے نکاح کرے تو ان دونوں کا نکاح باطل ہے، صحیح نہیں۔(۳۲)

جیسا کہ محولہ بالا کتاب کے اگلے صفحات میں واضح کیا گیا ہے، جمہور علماء اسلام کی رائے کے برخلاف اس فتویٰ کا سبب ملیشیا کے مخصوص حالات کو قرار دیا گیا تھا۔ فتویٰ کمیٹی کو اندیشہ تھا کہ ملائشیا میں مسلمان مردوں کو عیسائی عورتوں سے نکاح کی اجازت دینے سے 'ملّتِ اسلامیہ ملائشیا کے وجود کو خطرہ لاحق ہو جائے گا'(۳۳) اس اندیشہ کا پس منظر بیان کرتے ہوے محوّلہ بالا کتاب کے مصنف نے جنوب شرق ایشیا، بالخصوص اندونیشیا میں عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں کا حوالہ دیا ہے۔ ایسی شادیوں کو عیسائیت کی آغوش میں لے جانے کا ذریعہ بنایا جا سکتا تھا۔(۳۴) نیز کثیر تعداد میں مسلمان ملیشیائی خواتین شادی کے انتظار میں بیٹھی رہ گئیں تھیں۔(۳۵) مزید برآں مجلس کے ایک رکن کا کہنا تھا کہ: 'اسلام نے کتابیہ عورتوں کے ساتھ نکاح کی اجازت ایسے حالات میں دی تھی جب مسلمان کی شخصیت قوی تھی اور اس کا اثر غالب تھا۔ اب اجتماعی حالات بدل گے ہیں اور عورتیں فیصلہ کن اثر رکھتی ہیں'۔(۳۶)

۱۹۸۰ء میں اسی کمیٹی نے یہ فتویٰ صادر کیا کہ: 'جب عیسائی میاں بیوی میں سے کوئی ایک اسلام لائے تو وہ دونوں اس شرط کے ساتھ اپنے نکاح پر قائم رہ سکیں گے کہ خاندان کی زندگی اسلامی رہے۔'(۳۷) محولہ بالا کتاب کے مصنف کی یہ رائے درست معلوم ہوتی ہے کہ اس نئے فتویٰ کی ضرورت اس لیے پڑی کہ نکاح کی خاطر ترکِ اسلام سے روکا جا سکے، اور کسی مخصوص فقہی رائے پر اصرار سے مقاصدِ شریعت کی خلاف ورزی نہ عمل میں آئے۔(۳۸)

دوسرا مسئلہ بینک کے سود کا ہے۔۱۹۷۱ء میں ملیشیا کی اسلامی امور سے متعلق مذکورہ بالا فتویٰ کمیٹی نے کہا تھا کہ: 'امّت کی تجارت و صنعت کی ترقی کی خاطر بینکوں کے قرضوں پر سود (دینا) ضرورت کی بنیاد پر جائز ہے۔'(۳۹) یہی اجازت بینکوں میں جمع رقوم پر سود لینے کے بارے میں بھی دی گئی: 'اسلامی ادارے یا تجارتی کمپنیاں جن کے ممبران مسلمان ہوں ان کے بنکوں مین جمع سرمایوں پر جو سود ملے اسے لینا اس حرج کی بنا پر جائز ہے جس میں آج کل مسلمانوں کی اقتصاد یات مبتلا ہے..... یہی معاملہ افراد کی جمع کردہ رقوم کا بھی ہے.....(۴۰) مذکورہ بالا کتاب کے مصنّف، ڈاکٹر محمد فردوس نور الھدیٰ نے تفصیل سے ان مشکلات کا ذکر کیا ہے جن کے حوالہ سے، ضرورت اور رفع حرج کے فقہی اصولوں کی بنیاد پر یہ فتویٰ دیا گیا تھا۔(۴۱) دس سال بعد، ۱۹۸۰ء میں اسی مجلس نے یہ فتویٰ صادر کیا کہ: 'موجودہ بینک ربا پر مبنی ہیں لہٰذا ان سے نہ قرض لینا جائز ہے نہ ان میں رقوم جمع رکھنا۔ مجلس کے نزدیک معاشی ترقی کی خاطر لیے جانے والے قرضے اسلامی بینکوں کے ذ ریعہ لیے جانے چاہئیں، خواہ ملک کے اندر کے (اسلامی) بنکوں کے ذریعہ یا باہر، مثلاً جنیوا کے.....'(۴۲) جیسا کہ محوّلہ کتاب میں بتایا گیا ہے، ملائشیا میں اسلامی بینک کے قیام اور جنیوا میں دارالمال الاسلامی کی سرگرمیوں نے صورتِ حال بدل دی تھی۔ اب افراد اور ترقیاتی ادارو ں کے لیے حلال طریقہ سے قرض یا کاروباری سرمایہ حاصل کرنا ممکن ہو گیا تھا۔

جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا ہے، ہمیں اس سے بحث نہیں کہ کون سی رائے درست ہے اور کون سی نادرست۔ دیکھنا یہ ہے کہ بدلتے ہوئے حالات سے نبٹنے کے لیے معاصر فقہاء اور مفکرین مقاصدِ شریعت کی طرف کس طرح رجوع کرتے ہیں۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ ایسے فیصلے کریں جن سے کچھ لوگوں کو اتفاق ہو اور کچھ کو اختلاف۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ملک کے متّفق علیہ فیصلوں سے دوسرے ملکوں میں اختلاف کیا جائے۔ جب فیصلوں کا مدار مصالح پر ہو اور اس بات پر کہ کسی مخصوص صورتِ حال میں مقاصدِ شریعت کس طرح حاصل ہوسکیں گے، تو اختلاف ہونا غیر متوقع نہیں۔ جیسا کہ ہم نے جینیٹک انجینیر نگ والی مثال کے ذریعہ واضح کیا بعض اوقات اختلاف کی جڑیں مسئلہ کی نوعیّت، معلومات کی کمی، تجربات کی عدم تکمیل اور فیصلہ کرنے کے لیے ماحول کے تقاضوں میں اس طرح پیوست ہوتی ہیں کہ کسی متفقہ فیصلہ تک پہنچنا ممکن نہیں ہوتا۔

اس سے پہلے ہم مقاصدِ شریعت کے فہم وتطبیق میں اختلاف کے حل پر غور کر چکے ہیں(۴۳)۔ آج کی بحث واضح کرتی ہے کہ یہ سمجھنا کہ اس بارے میں اختلاف کا حل ہمیشہ اتفاق کی صورت میں

ہو گا، غیر حقیقت پسندانہ ہے۔ مسائل کی نوعیّت، انسانی علم کی محدودیت، اور ماحول کا یہ دباؤ کہ جلد کوئی فیصلہ کیا جائے متعلّقہ لوگوں کو کوئی موقف اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ کسی دوسرے، غیر متعلق، عالم، مفکر یا فقیہ کے لیے اس موقف کی کمزوریاں واضح کرنا آسان ہے مگر اس اختلاف کو اتفاق تک پہنچانا آسان نہیں۔ اوّلاً تو اس کے لیے وقت اور وسائل چاہئیں اور ثانیاً اس کے باوجود اختلاف باقی رہنا وارد ہے، خاص طور پر جہاں اختلاف کی جڑیں ملکی عادات اور رواج نیز تاریخی اسباب میں پیوستہ ہوں۔ ہمیں اختلاف کو گوارا کرنا ہو گا اور امّت میں ایک ایسی فضا بنانی ہوگی کہ مقاصدِ شریعت کی پہچان اور ان کی تحصیل کے طریقوں میں فرق، نیز ا ن کی تحصیل کے درجوں میں تفاوت کے با وجود لوگ ایک دوسرے کے ساتھ حسنِ ظن سے کام لیں اور خوش معاملگی کے ساتھ رہیں۔

## حواشی

۱۔ ''القرار'' ۸/۳، المجلس الاوروبی للافتاء و البحوث کا ریزولوشن در مسئلہ: عورت کا اسلام لانا اور اس کے شوہر کا اپنے دین پر قائم رہ جانا۔

۲۔ قرارات و توصیات مجمع الفقه الاسلامی المنبثق من منظّمة المنو تمر الاسلامی. جدّہ، الدورات ۱۔۱۰، القرارات ۱۔۹۷۔ دمشق، دارالقلم؛ جدّہ، مجمع الفقه الاسلامی. ۱۹۹۸ء۔ صفحات ۴۲۔۴۳، قرار نمبر ۲۳ جو ۱۹۸۶ء کے جلسہ میں طے پایا۔ مجمع الفقہ کی قرار دادیں اس کی ویب سائٹ پر دیکھی جا سکتی ہیں:
http://www.fiqhacademy.org.sa/

۳۔ مقاصدِ شریعت، تعارف اور تطبیق۔ایفا پبلیکیشنز جامعہ نگر، نئی دہلی۔۲۰۰۲۔ ملاحظہ ہو، ڈاکٹر صلاح الدین سلطان: مسلم اکثریتوں کی مشکلات اور مقاصدِ شریعت، خاص طور پر صفحات ۳۴۵ ۔۳۵۵ نیز ملاحظہ ہو: صفحہ ۲۰۲۔۲۱۰، فقه المقاصدی، اناطة الاحکام الشرعیة بمقاصدها، د۔ جاسر عودہ۔ ہرنڈان، ورجینیا۔ المعهد العالمی للفکر الاسلامی، ۲۰۰۶ء۔

۴۔ مقاصدِ شریعت، تعارف اور تطبیق: صفحہ ۳۴۵

۵۔ مقاصدِ شریعت، تعارف اور تطبیق: صفحہ ۳۵۰

۶۔ خالدالطراولی: الخطاب الاسلامی فی الغرب بین الاشکالیات والبناء، الجزء الثالث: هجرة الحبشه والنموذج المنشود p://www.nawaat.org/portail/article.php3?id_article=869

۷۔ سالم الشیخی: انٹرویو
www.islamicnews.org.sa/print.php?id=1146416118&archive=

۸۔ Muslims In The West, A Fiqh Seminar In France,13-15 Muharram 1413,13-15 July 1992.Summary by Dr. Sayyid Al-Darsh,Typesetted by J.P.T.LTD.London. pp.13-14

۹۔ طارق رمضان، برسلز میں ۲۱ فروری ۲۰۰۶ء کو دیا ہوا انٹرویو:
http://euro-islam.info/pages/pubs_interview_ramadan.html

۱۰۔ احمد صدقی دجانی: تفاعل حضاری فی میثاق اسلامی المانی،
http://www.arabtimes.com/ara%20hora/doc24.html

۱۱۔ شیخ راشد غنوشی: الحریّات العامّہ فی الدولۃ الاسلامیہ، ۱۹۹۳ء، بیروت، مرکز دراسات الوحدۃ العربیہ، صفحہ ۳۶۳)

۱۲۔ ww.islamonline.net نیز کچھ اور رایوں کے لیے ملاحظہ ہو:
http://www.robert-fisk.com/islam_online_fatwa_oct16_2001.htm

۱۳۔ شیخ راشد غنوشی: الحریّات العامّہ فی الدولۃ الاسلامیہ، ۱۹۹۳ء، بیروت، مرکز دراسات الوحدۃ العربیہ، صفحہ ۳۶۰)

۱۴۔ محمد نجات اللہ صدیقی: مقاصد شریعت۔ ایک عصری مطالعہ۔ صفحہ ۲۱۔ فکر و نظر، اسلام آباد، جلد ۴۱ شمارہ ۴۔ اپریل-جون ۲۰۰۴ء۔

۱۵۔ شیخ یوسف قرضاوی: ۱۲ تا ۱۴ اپریل ۲۰۰۴ء دمشق میں منعقد ہونے والے ۔الملتقی الاسلامی الاوّل:الاجتھاد بین الافراط و التفریط۔ میں دیا ہوا بیان، بحوالہ
http://www.alwatan.com/graphics/2004/04apr/24.4/dailyhtml/deenhtml

۱۶۔ ملاحظہ ہو طارق البشری کا مقالہ: Participation of Non-Muslims in Government in Contemporary Muslim Societies جو عبد الوہاب الافندی کی مرتب کردہ درج ذیل کتاب میں شامل ہے: Rethinking Islam and Modernity: Essays in Honour of Fathi Osman (2001) Leicester , The Islamic Foundation,pp.66-83

۱۷۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو، ڈاکٹر عبدالحق انصاری: پاکستان کا صدارتی انتخاب اور عورت کی سربراہی کا مسئلہ، رسالہ زندگی، رامپور، ذوالحجہ ۱۳۸۴ھ مطابق اپریل ۱۹۶۵ء۔ صفحات ۶۴ تا ۹۵]۔

۱۸۔ خط بنام امین الحسن رضوی، ۱۶ دسمبر ۱۹۶۴ء۔ مکاتیب سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، مرتبہ عاصم نعمانی۔ اسلامک پبلیکیشنز، لاہور۔ ۱۹۸۲ء، صفحات ۱۹۔۲۰

۱۹۔ ۲۰۰۵، دمشق، جدہ۔ مرکز الرایۃ للتنمیۃ الفکریہ. خاص طور پر صفحہ ۱۹۱ تا ۲۱۶

۲۰۔ المرائۃ بین القرآن الکریم و واقع المسلمین، حاشیہ صفحہ ۲۰۶۔

۲۱۔ المرائۃ بین القرآن الکریم و واقع المسلمین، صفحہ ۱۱۴ تا ۱۳۶۔

۲۲۔ سورہء نور، آیت ۳۱

۲۳۔ سورہ احزاب، آیت ۵۹۔

۲۴۔ www.asharqalawsat.com/english/news.asp?section=3&id=4678 یہ ڈاکٹر حسن ترابی کا وہی انٹرویو ہے جس کا تفصیلی ذکر مقالہ کے شروع میں آ چکا ہے۔ نیز ملاحظہ ہو اس سے پہلے کا ایک انٹرویو:
Islam,Democracy,the State and the West, Horizons, March 1990

۲۵۔ Murad Wilfried Hofman: On the Development of Islamic Jurisprudence, The American Journal of Islamic Social Sciences, vol.16,no.1,pp.80-81

۲۶۔ شاہ ولی اللہ دہلوی: حجۃ اللہ البالغہ، جلد ۱، دہلی ۱۳۷۳ھ۔ شرکۃ امین۔ صفحات ۸۹۔۹۱

۲۷۔ هدیٰ هلال: تفعیل مقاصدالشریعه فی الاجتهاد فی قضایا الهندسة الوراثیّه، صفحات ۶۴۰ تا ۹۵۶، جلد ثانی، مقاصد الشریعة و سبل تحقیقها فی المجتمعات المعاصره، ۲۰۰۶ء، کوالا لمپور، الجامعة الاسلامیة العالمیة بمالیزیا.

۲۸۔ صفحہ ۶۵۷-۶۵۸، حوالہ بالا

۲۹۔ محمد رضی الاسلام ندوی (مترجم) جدید فقہی مسائل اور ان کا مجوزہ حل۔ بین الاقوامی اسلامی فقہ اکیڈمی کے فقہی اجلاسوں کی قراردادیں اور سفارشات۔ مرتبہ عبدالستار ابو غدہ۔ ۲۰۰۶ء۔ کراچی، ماڈرن فقہ اکیڈمی۔ ملاحظہ ہو: صفحہ ۲۵۶-۲۶۴؛ ۱۴۱-۱۴۲ اور صفحہ ۲۹۷۔

۳۰۔ hedge funds اور اسلامک ہیج فنڈ کے موضوع پر تازہ ترین معلومات انٹرنٹ کے ذریعہ حاصل کی جا سکتی ہیں۔ نیز ملاحظہ ہو:

Robert Shiller (2003) The New Financial Order,Risk in the 21st Century, Princeton University Press Princeton, خاص طور پر صفحہ ۲۳۷-۲۳۸۔

نیز: Bill Gross (2004) Investment Outlook: Lemonade for Sale in PIMCO Advisor August 2004 اسلامی نقطۂ نظر سے جائزہ کے لیے، دیکھئے: Mohammad Obaidullah: King Abdulaziz University, Islamic Financial Services (2005) Jeddah, Scientific Publishing Centre خاص طور پر صفحہ ۱۷۶ اور ۵۲۲ نیز ملاحظہ ہو: Mahmoud A. El-Gamal: Islamic Finance, Law, Economics, and Practice (2006) Cambridge University Press خاص طور پر صفحہ ۱۸۰-۱۸۱

۳۱۔ محمد فردوس نورالهدیٰ: آثار الظروف الاجتماعیّه علی الفتاوی الشرعیّة: مالیزیا نموذجاً. ۲۰۰۳ء۔ مرکز البحوث، الجامعة الاسلامیّه العالمیّه بمالیزیا. کوالالمپور۔ مذکورہ مجلس اور اس کی فتویٰ کمیٹی کے تعارف کے لیے ملاحظہ ہو صفحات ۱۰ تا ۳۷۔

۳۲۔ محمد فردوس نور الهدیٰ؛ آثار الظروف الاجتما عیة علی الفتاو یٰ الشرعیّه: مالیزیا نموذجاً. ۲۰۰۳. کوالا لمپور، مرکزالبحوث، الجامعة الاسلامیه العالمیّه بمالیزیا. صفحہ۶۰

۳۳۔ صفحہ ۶۳، حوالۂ بالا۔

۳۴۔ صفحہ ۶۲-۶۵، حوالہ بالا۔

۳۵۔ صفحہ ۶۶-۶۸، حوالہ بالا۔

۳۶۔ صفحہ ۶۹، حوالۂ بالا۔

۳۷۔ صفحہ ۷۵، حوالہ بالا)۔

۳۸۔ صفحہ ۷۶-۷۷، حوالہ بالا

۳۹۔ صفحہ ۸۱، حوالہ بالا

۴۰۔ صفحہ ۱۸، حوالہ بالا۔

۴۱۔ صفحہ ۸۱-۹۸، حوالہ بالا۔

۴۲۔ صفحہ ۹۹، حوالہ بالا۔

---